



عدل کے بارے میں سُنَّۃُ اللہ

مفتی منیب الرحمن

اللہ تعالیٰ عادل ہے اور قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”بے شک اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، (الحجرات: 9)۔“ (2)۔ ”بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو واپس کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل پر مبنی فیصلہ کرو، بے شک اللہ تمہیں کیسی عمدہ نصیحت فرماتا ہے، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے، (النساء: 59)۔“ اللہ تعالیٰ مالک و مختار اور قادر مطلق ہے، وہ اپنے عدل کے لیے کسی کو جواب دہ نہیں ہے، وہ میزانِ عدل اور نظامِ عدل قائم کیے بغیر اپنے علمِ قطعی کی بنیاد پر جہنمیوں کو جہنم میں اور جنتیوں کو جنت میں داخل فرما سکتا ہے، کوئی اُس سے پوچھنے والا نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”آج کے دن (اعمال کا) وزن حق ہے، (الاعراف: 8)۔“ اسلام میں عقل پرستوں کا ایک فرقہ معتزلہ گزرا ہے، اُن کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ حشر کے دن اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ فرمائے گا، اُسے میزانِ عدل قائم کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے اور مزید یہ کہ اعمالِ عوارض ہیں، ان کا اپنا کوئی مستقل بالذات وجود نہیں ہوتا، جیسے بدن کا درجہ حرارت بدن کے ساتھ قائم ہے، بدن سے جدا اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا، یہی صورت حال امراض کی ہے کہ وہ مریض کے وجود کے ساتھ قائم رہتی ہیں، امراض کا مریض سے الگ کوئی ذاتی اور خارجی وجود نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے برعکس جمہورِ علمائے امت کا عقیدہ ہے کہ اعمال کا وزن ہوگا اور اس کے باوجود کہ اعمالِ عوارض ہیں، اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ اُن کا وزن کرے، اُس کی کیفیت کے بارے میں علماء نے مختلف صورتیں بیان کی ہیں، لیکن اُس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ الغرض اعمال کا وزن حق ہے اور اس دنیا میں رہتے ہوئے ہمارا اس کی حقیقت پر مطلع ہونا ضروری نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا محشر میں میزانِ عدل قائم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ سُنَّۃُ اللہ یہ ہے کہ عدل ہو اور ہوتا ہوا نظر بھی آئے۔

عدل کے لیے شہادت ناگزیر ہے اور قاضی محض اپنے علم کی بنیاد پر فیصلے صادر نہیں کرتا، بلکہ عدالتی فیصلے اعترافِ جرم یا شہادتوں پر مبنی ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام فرمایا ہے، ارشاد ہوا (1)۔ ”جب (اُس کے ہر قول و فعل کو) دو فرشتے حاصل کر لیتے ہیں، جو اُس کے دائیں اور بائیں جانب بیٹھے ہوئے ہیں، وہ جو بات بھی کہتا ہے (اُس کو لکھنے کے لیے) اُس کا محافظ (فرشتہ) تیار رہتا ہے، (ق: 17-18)۔“ (2)۔ ”آج ہم اُن کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور اُن کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور اُن کے پاؤں اُن

کے اعمال کی گواہی دیں گے، (یس: 65)۔“ (3) ”جس دن اُن کی زبانیں، اُن کے ہاتھ اور اُن کے پاؤں (اُن کے اعمال کے بارے میں) گواہی دیں گے جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے، (النور: 24)۔“ قرآن کریم نے یہ بھی بتایا کہ بندوں کے اعمال کا ریکارڈ مرتب کیا جا رہا ہے: ”اور بے شک اُن پر نگہبان (مقرر) ہیں، معزز لکھنے والے، تم جو بھی عمل کرتے ہو، وہ جانتے ہیں، (الانفطار 10-12)۔“

پس اللہ کی سنت یہی ہے کہ حقیقی معنی میں عدل قائم ہو اور شفاف عدل ہوتا ہو اور نظر بھی آئے۔ حدیث پاک میں ہے: عبدالرحمن بن ابی بکرہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد نے جحشتان کے قاضی عبید اللہ بن ابی بکرہ کو یہ ہدایت نامہ لکھوایا: ”غصے کی حالت میں (کبھی بھی) دو اشخاص کے درمیان فیصلہ نہ کرنا، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ”تم میں سے کوئی بھی شخص غصے کی حالت میں دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے، (صحیح مسلم: 1717)۔“

یہ سطور میں نے اس لیے تحریر کیں کہ آج کل ایک تاریخی مقدمہ ہماری عدالتِ عظمیٰ میں چل رہا ہے اور اس کے لیے مختلف اداروں کے ماہرین پر مشتمل ایک مشترکہ تحقیقاتی ٹیم (JIT) اُس کی نگرانی میں سرگرم عمل ہے۔ سیاست دانوں کا ایک طبقہ اُس کے مدّاحین میں شامل ہے، جو یقیناً قابلِ فہم ہے، جب کہ دوسرا طبقہ اُس کے متاثرین اور مجروحین میں شامل ہے اور اُن کی آہ و فغاں بھی قابلِ فہم ہے۔ اصل بات عدالتِ عظمیٰ کا رویہ ہے، جو اس طرح ٹھنڈے مزاج کا حامل نظر نہیں آ رہا جیسا کہ آنا چاہیے۔ فاضل جج صاحبان کا تاثر مغلوب الغضب والا نہیں ہونا چاہیے اور نہ یہ تاثر پیدا ہو کہ گویا وہ فیصلے کے حوالے سے ذہن بنا چکے ہیں، بس صرف رسمی کارروائی باقی ہے۔ ایک طرف فاضل عدالت اٹارنی جزل سے کہے کہ ایس ای سی پی کے بارے میں آفیشل اسٹیٹمنٹ دیں اور دوسری طرف تصویر کے افشا ہونے کے بارے میں وہی عدالت یہ کہے کہ ذمے دار شخص کے خلاف کارروائی ہوگئی ہے، کسی کو ذمے دار شخص کے نام سے آگاہ بھی نہیں کیا گیا۔ اگر اس کا یہ فعل کسی سطح کا جرم نہیں تھا تو کارروائی ”چہ معنی دارد“ اور اگر یہ جرم تھا تو اسے پردہ اخفا میں کیوں رکھا جا رہا ہے، زبانوں پر مہر کون لگائے گا، کہنے والے تو کہیں گے: ”کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔“ اسی طرح فاضل جج صاحبان کا ٹی وی ٹاک شوز اور کالموں کا حوالہ دینا بھی مناسب نہیں ہے، اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ ان چیزوں سے مثبت یا منفی اثر لیتے ہیں اور جج جب یہ ریمارکس دے: ”ہم یہاں بات کرتے ہیں تو چیخیں نکل جاتی ہیں“، تو عدالت کی شفافیت بھی مجروح ہوتی ہے، کیونکہ ہم نے پاکستان کی تاریخ میں کسی عدالت کے ایسے ریمارکس نہیں سنے، ہو سکتا ہے اس کا سبب ہماری کم علمی ہو۔ ہم ہمیشہ سے لکھتے آئے ہیں کہ افراد سے قطع نظر ریاست کے اعلیٰ مناصب کی تکریم ہونی چاہیے، لیکن وہ عزت عارضی ہوتی ہے جو منصب کی مرہونِ منت ہو، حقیقی عزت وہ ہے جو صاحبِ منصب سے منصب کو ملے۔ ذرا سوچیے! جسٹس افتخار محمد چوہدری کے رعب، دبدبے اور ہیبت کا عالم دیدنی تھا، مگر آج وہ بھولی بھری کہانی ہیں، جب کہ جسٹس عبدالرشید، جسٹس اے آر کارنیلیس اور جسٹس محمد رستم کیانی کا نام آج بھی احترام سے لیا جاتا ہے۔

منصبِ عدالت وراثتِ نبوت ہے، آپ ﷺ نے اسے بہت تکریم عطا کی ہے، فرمایا: عادل حاکم کا (انصاف کرنے میں گزرا

ہوا) ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی ایک حد، جو حق پر قائم کی جائے، زمین کو اتنا پاک کرتی ہے جو چالیس سال کی بارش بھی نہ کر سکے، (المعجم الکبیر للطبرانی 11932)۔ یہ اس لیے کہ ساٹھ سال عبادت کرنے والا اپنی فلاح کی فکر میں سرگرداں رہتا ہے اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت اور مظلوموں کی دادرسی کرنے والا عادل حاکم دوسرے انسانوں کے لیے بارانِ رحمت کی مانند فیض رساں ہوتا ہے اور مظلوموں کی دعائیں لیتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے: ”جب حاکم اپنی پوری علمی و فکری صلاحیت کو کام میں لا کر فیصلہ کرے اور اس سے (خدا نخواستہ) خطا بھی ہو جائے، تب بھی اسے ایک اجر ملے گا، (صحیح بخاری: 7352)۔“ یعنی یہ وہ شعبہ ہے جس میں غیر ارادی خطا پر بھی اجر ہے۔

منصب عدالت پر فائز حاکم پر ہمیشہ خشیتِ الہی طاری رہنی چاہیے کہ ذرا سی غفلت سے کسی کا حق تلف ہو سکتا ہے یا کسی کو استحقاق کے بغیر کچھ مل سکتا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم میرے پاس اپنے مقدمات لے کر آتے ہو، ہو سکتا ہے تم میں سے کوئی فریق اپنا موقف پیش کرنے میں زیادہ حجت باز ہو اور میں (دلائل سن کر) اُس کے بھائی کے حق میں سے کوئی چیز اُسے دے دوں، تو (وہ یوں سمجھے کہ) میں اسے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں، سو وہ اسے (ہرگز) نہ لے، (بخاری: 2680)۔“ رسول اللہ ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ اشیاء اور معاملات کی حقیقت پر مطلع فرما دیتا تھا، لیکن عام قاضی اور حاکم کا تو یہ مقام نہیں ہے۔ اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ عدالتی فیصلہ قانون کی طاقت سے نافذ تو ہو جاتا ہے، لیکن عند اللہ اس سے حقائق نہیں بدلتے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حقائق کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”(اے رسول!) بے شک ہم نے آپ کی طرف حق پر مبنی کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اُس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھایا ہے اور آپ خیانت کرنے والوں کے وکیل (دفاع کرنے والے) نہ بنیں، (النساء: 105)۔“ لہذا عند اللہ قاضی پر لازم ہے کہ حق اور حقائق پر مبنی فیصلہ کرے اور کسی فریق کی رعایت نہ کرے، خواہ وہ کتنا ہی با اختیار و بارسوخ ہو۔ نہایت ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ زیر بحث مقدمے میں عدالت کا تاثر جارحانہ اور مغلوب الغضب نظر آتا ہے، حقائق و شواہد کی روشنی میں فیصلہ جو بھی آئے، عدالت کا تاثر مثبت اور غیر جانبدار نظر آنا چاہیے۔

چونکہ فیصلوں کا مدار شہادتوں اور حقائق پر ہوتا ہے، اس لیے اس کے بارے میں بھی قرآن کریم نے دو ٹوک انداز میں ہدایت دیتے ہوئے فرمایا: ”اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے، اللہ (کی رضا) کے لیے گواہی دینے والے ہو جاؤ، خواہ (یہ گواہی) تمہارے ماں باپ اور قرابت داروں کے خلاف (ہی) ہو، (فریق معاملہ) خواہ غنی ہو یا فقیر، اللہ تعالیٰ اُن کا زیادہ خیر خواہ ہے، پس تم خواہشِ نفس کے تحت عدل سے روگردانی نہ کرو اور اگر تم نے گواہی میں ہیر پھیر کی یا اعراض کیا، تو اللہ تمہارے سب کاموں کی خوب خبر رکھنے والا ہے، (النساء: 125)۔“ سورہ بقرہ آیت: 283 میں گواہوں کے بارے میں تین واضح ہدایات ہیں: (1) ”گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو اسے چھپائے گا تو اس کا دل گناہ گار ہے، (2) گواہوں کو جب گواہی دینے کے لیے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں، خاص طور پر اس صورت میں کہ صرف اُن کی شہادت پر ہی کسی کے حق کے ثبوت کا انحصار ہو، (3) دستاویز لکھنے والے اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے، یعنی انہیں تحفظ فراہم کیا جائے تاکہ حق داروں کا حق ضائع نہ ہو۔